بسم اللہ الرحمن الرحیم وبہ نستعین......

اداریہ

مسجد اقصی، قبلہ اول اور فلسطین

امریکہ نے اسرائیل میں اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے یروشلم منتقل کرنے کا اعلان کردیا ھے، ملک کے مقتدر کالم نویسوں نے اس پر قابل غور کالم لکھے ھیں وہ لکھتے ھیں: لیکن سوال یہ ہے کہ جب بین الاقوامی قوانین کے تحت یروشلم اسرائیل کا شہر ہی نہیں ہے تو سفارت خانہ وہاں منتقل کیسے ہوسکتا ہے؟

یہ سوال بہت ہی اہم ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو ممالک اسرائیل کے ناجائز وجود کو بطور ریاست تسلیم کرچکے ہیں وہ بھی اس اقدام کی حمایت نہیں کر پا رہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس اقدام کی کوئی توجیح پیش نہیں کی جاسکتی۔

اسرائیل کے ناجائز قیام کی بحث کو ایک طرف رکھ دیجیے اور اسی بیانیے میں معاملے کو دیکھ لیجیے جس بیانیے میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ برطانیہ اور اقوام متحدہ کی سرپرستی میں جب اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تو یہ بات طے کردی گئی کہ یروشلم کا شہر اسرائیل کا حصہ نہیں ہوگا۔

سوشلسٹ روس کے زوال کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے کئی دیسی سوشلسٹ مشرف بہ امریکا ہو کر لبرل کہلانے لگے۔ دیسی سوشلسٹ کم از کم فلسطینیوں کی آزادی کے حق میں اور اسرائیل و امریکا کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے تھے۔ تاہم کایا پلٹ کے بعد "شوقیہ لبرل" بننے والے تو خیر و شر کا فرق ہی بھول گئے ہیں۔ ان شوقیہ لبرلز کی دیکھا دیکھی "اعتدال" اور "داعیانہ اسلوب" کے مدعی کچھ مولوی صاحبان بھی اسرائیل اور امریکا کے خلاف بولنے والوں کو کوسنے دینے لگے ہیں۔ ایک عام مغالطہ یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فلسطین اور یروشلیم کی سرزمین یہود کی ہے، اس لیے یروشلیم کو اسرائیل کا دارالحکومت بنائے جانے پر اعتراض غلط ہے۔ یہ دعوی تسلیم کرنے کے لیے دو کام کرنے پڑتے ہیں: ایک، اس سرزمین کی ابدی ملکیت کے متعلق یہود کا دعوی تسلیم کیا جائے؛ اور دوسرے، معاصر بین الاقوامی قانون کے تمام اصول نظر انداز کیے جائیں۔

پہلی بات اس وقت قطعی غیر متعلق ہے۔ بعض مسلمان اہلِ علم نے یہود کے "حقِ تولیت" کے لیے قرآن وحدیث سے استدلال کی روش بھی اختیار کی ہے۔ اس استدلال کی صحت یا عدمِ صحت پر بحث بھی اس وقت قطعی غیر متعلق ہے۔ اصل بحث یہ ہے کہ معاصر بین الاقوامی قانون یہود کا "حقِ ملکیت" تسلیم کرتا ہے یا نہیں؟

پہلی جنگِ عظیم تک بین الاقوامی قانون کی رو سے کسی سرزمین پر کسی ریاست کا حقِ ملکیت تسلیم کرنے کے جو جائز طریقے تھے، ان میں ایک طریقہ "فتح" (Conquest) تھا بشرطیکہ اس کے بعد فاتح ریاست اس مفتوحہ علاقے کا الحاق (Annexation) کرلیتی۔ اسی اصول پر 1857ء کے بعد سے ہندوستان کو برطانوی بادشاہت کا حصہ قرار دیا گیا اور اسے "برطانوی ہند" (British India) کہا جانے لگا اور برطانیہ کی ملکہ ہندوستان کی بھی ملکہ ہوگئیں۔ یہ اصول پہلی جنگِ عظیم کے بعد تک بین الاقوامی قانون میں تسلیم کیا گیا۔ تاہم 1928ء میں امریکا اور فرانس نے آپس میں معاہدہ کرکے یہ اصول طے کیا کہ جنگ کے ذریعے علاقے فتح کرنا ناجائز ہے۔ کچھ ہی عرصے میں دیگر ریاستوں نے بھی اس معاہدے کو، اور اس کے ذریعے طے شدہ اصول کو، تسلیم کرلیا۔ چنانچہ 1928ء کے معاہدۂ پیرس کے بعد سے "فتح" کے ذریعے کسی علاقے کے "الحاق" کو بین الاقوامی قانون تسلیم نہیں کرتا۔ اب فاتح ریاست کو "قابض طاقت" (Occupying Power) اور مفتوحہ علاقے کو "مقبوضہ علاقہ" (Occupied Territory) کہا جاتا ہے اور اصول یہ طے کیا گیا ہے کہ جب تک قبضہ ختم نہیں ہوجاتا، حالتِ جنگ برقرار رہتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ اصول بھی مانا گیا ہے کہ قابض طاقت کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ مقبوضہ علاقے کی آبادی یا جغرافیے میں کوئی مستقل اور دوررس تبدیلی لائے کیونکہ جلد یا بدیر اس قابض طاقت کو اس مقبوضہ علاقے سے نکلنا پڑے گا۔

29 نومبر 1947 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد نمبر 181 کے تحت یہ قرار دیا کہ یروشلم کی حیثیت "Corpus Separatum" کی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شہر اب کسی ایک ریاست کا حصہ نہیں۔ اس کی الگ اور جداگانہ حیثیت ہے۔ اقوام متحدہ نے کہا کہ چونکہ اس شہر کی مذہبی حیثیت ایسی ہے کہ یہ تینوں مذاہب کے لیے محترم ہے اسے لیے اس علاقے میں اسرائیل اور فلسطین نام سے دو ریاستیں تو وجود میں آرہی ہیں لیکن یروشلم کا شہر "Corpus Separatum" ہوگا اور اس کا انتظام اقوام متحدہ چلائے گی۔ یہی بات جنرل اسمبلی نے گیارہ ستمبر 1948 کی اپنی قرارداد نمبر 194 میں کہی اور اسی بات کا اعادہ فلسطین پر اقوام متحدہ کے کمیشن (UNCCP) نے 1949 میں سوئٹزرلینڈ کے شہر لاؤزین میں اس کانفرنس میں کیا جو 27 اپریل سے 12 ستمبر تک جاری رہی۔

اسرائیل نے 1949 میں مصر، اردن، شام اور لبنان سے معاہدے کیے جنہیں "Armistice Agreement یعنی صلح کے معاہدے کہا جاتا ہے، ان میں بھی یروشلم شہر کی یہ حیثیت برقرار رکھی گئی۔ چنانچہ ایک انتظام کے تحت مشرقی یروشلم اردن کے پاس چلا گیا۔ یاد رہے کہ مسجد اقصی، قبۃ الصخرا، مغربی دیوار، اور چرچ آف دی ہولی سپیلکر یعنی کنیسہ القیامہ اسی مشرقی یروشلم میں واقع ہیں۔ 1967 تک یہ مقامات مسلمانوں کے پاس رہے اور اردن ہی ان کے انتظامی معاملات کو دیکھتا رہا۔

1967 کی جنگ میں اسرائیل نے مشرقی یروشلم پر قبضہ کرلیا لیکن دنیا نے اس قبضے کو آج تک تسلیم نہیں کیا۔ اقوام متحدہ کے مطابق مشرقی یروشلم ''مقبوضہ فلسطین'' ہے اور اسے اسرائیل نہیں کہا جا سکتا۔ سلامتی کونسل نے 22 نومبر 1967 کو قرارداد نمبر 242 کے ذریعے اسرائیل کے قبضے کو ناجائز قرار دیا اور اسے مشرقی یروشلم سے نکل جانے کو کہا۔ اس قرارداد کو امریکہ سمیت 15 ممالک کے ووٹ ملے، نہ کوئی ملک غیر حاضر رہا نہ کسی نے اس کے خلاف ووٹ دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 4 جولائی 1967 کو قرارداد نمبر 2253 کے ذریعے اسرائیلی قبضے کو غیر قانونی اور ناجائز قرار دیا۔ اس میں کہا گیا کہ اسرائیل ہر ایسے اقدام سے باز رہے جو یروشلم شہر کی طے شدہ حیثیت کو تبدیل کرتا ہو۔ 99 ممالک نے اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیا اور کسی ایک ملک نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔

تاریخی طور پر مسلم ہے کہ یہود کو رومیوں نے پہلی صدی عیسوی میں فلسطین سے نکال دیا تھا اور اس وقت کے بین الاقوامی عرف اور قانون کے مطابق اس سرزمین پر فاتح طاقت، یعنی رومی سلطنت، کی ملکیت قائم ہوگئی۔ ساتویں صدی عیسوی میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اس کی ملکیت مسلمانوں کو منتقل ہوئی اور یہ ملکیت بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا تک برقرار رہی۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اس علاقے پر برطانیہ کا قبضہ ہوا لیکن برطانیہ نے اس پر اپنا حقِ ملکیت قائم نہیں کیا بلکہ اسے امانت کے طور پر قبول کیا۔ جنگ کے بعد وجود میں لائی جانے والی تنظیم مجلسِ اقوام" (League of Nations) نے اس علاقے کو ترقی دینے اور یہاں کے لوگوں کو اپنی حکومت سنبھالنے کے لائق بنانے، بہ الفاظِ دیگر "مہذب بنانے"، کی ذمہ داری (Mandate) برطانیہ کو دے دی۔ 1948ء تک یہ علاقہ برطانیہ کے پاس امانت کے طور پر ہی رہا اور برطانیہ نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذمہ داری

پوری نہیں کی بلکہ اس امانت میں بھرپور خیانت بھی کی ۔ 1948ء میں برطانیہ نے مجلسِ اقوام کی وارث تنظیم ، یعنی اقوامِ متحدہ کو کہا کہ وہ مزید اس امانت کا بار نہیں اٹھا سکتا ۔ اقوامِ متحدہ نے یہ علاقہ برطانیہ سے واپس لے کر اسے یہود اور عربوں کے درمیان تقسیم کر دیا ۔ اقوامِ متحدہ کو اس تقسیم کا اختیار تھا یا نہیں اور کیا یہ تقسیم منصفانہ اور جائز تھی یا نہیں؟ اس پر تفصیلی بحث کی جاسکتی ہے ۔ تاہم اگر اس بحث کو نظر انداز بھی کیا جائے تو یہ دو حقیقتیں بہر حال مسلم ہیں:

ایک یہ کہ 1948ء میں جس سرزمین پر "اسرائیل" کی ریاست قائم ہوئی اس میں یروشلیم شامل نہیں تھا؛

دوسری یہ کہ یروشلیم سمیت جن علاقوں پر اسرائیل نے 1967ء کی جنگ میں قبضہ کیا وہ اسرائیل کا حصہ نہیں ، بلکہ اس کے "مقبوضہ علاقے اور 1928ء کے معاہدۂ پیرس کے بعد سے بین الاقوامی قانون مقبوضہ علاقے پر قابض طاقت کا حقِ ملکیت تسلیم نہیں کرتا ۔

چنانچہ اسرائیل یروشلیم اور دیگر مقبوضہ علاقوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں لاسکتا ؛ نہ وہ وہاں آبادکاری کرسکتا ہے ، نہ ہی وہاں ایسی دیوار تعمیر کرسکتا ہے جو اس علاقے کو مستقل طور پر تقسیم کردے ۔ یہ بات 2003ء میں بین الاقوامی عدالتِ انصاف (International Court of Justice) نے اپنے فیصلے میں تفصیلی طور پر واضح کی ہے ۔ اس وجہ سے بین الاقوامی قانون کی رو سے قطعی طور پر ناجائز ہے کہ یروشلیم یا مقبوضہ علاقے کے کسی بھی حصے کو اسرائیل کا دارالحکومت بنایا جائے ۔

عالم اسلام کو انکل سام کے اس فیصلہ کی شدید مخالفت کرتے ھوے فلسطین کی آزادی کو یقینی بناتے ھوے قبلہ اول ، مسجد اقصی کو آزاد کرانے کا یہ موقع ضایع نھیں کرنا چاہیے- آج پھر 1980 جیسا اقدام کرنے کی ضرورت ھے جب 980 میں اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کو پامال کرتے ہوئے اعلان کر دیا تھا کہ یروشلم اس کا دارالحکومت ہوگا ۔ اسرائیل نے دنیا سے کہا کہ وہ اپنے سفارت خانے یروشلم منتقل کرے ۔ اس اقدام سے اسلامی دنیا میں بھونچال آ گیا اور او آئی سی نے کہا کہ جو ملک اپنا سفارت خانہ یروشلم لے گیا تمام اسلامی ممالک سے اس کے سفارت خانے بند اور سفارتی تعلقات منقطع کر دیے جائیں گے ۔ اس دوران اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے پہلے 30 جون کو قرارداد نمبر 476 اور پھر 20 اگست 1980 کو قرارداد نمبر 478 پاس کی اور اسرائیل کے اس قدم کو انٹرنیشنل لاء کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے تمام ممالک سے کہا کہ اقوام متحدہ کے فیصلے کو مانیں اور کوئی ملک بھی اپنا سفارت خانہ یروشلم نہیں لے جائے گا ۔ اس قرارداد کے حق میں 14 ووٹ آئے جب کہ کسی ایک ملک نے بھی مخالفت نہیں کی ۔ امریکہ البتہ غیر حاضر رہا ۔ چنانچہ اس قرارداد کے فورا

بعد بولیویا، چلی، کولمبیا، کوسٹاریکا، پانامہ، یوروگوائے ، وینزویلا، ایکواڈور، سالواڈور جیسے ممالک نے جو اپنے سفارت خانے یروشلم منتقل کر چکے تھے واپس تل ابیب لے کر آ گئے۔حتی کہ امریکہ کو بھی یہ ہمت نہ ہوسکی کہ وہ اپنا سفارت خانہ یروشلم لے جائے۔دسمبر 1980 میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسرائیل کے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دیا اور کہا کہ اسرائیل چوتھے جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔وہ اس سے باز رہے۔

یروشلم کے بارے میں اقوام متحدہ واضح طور پر طے کر چکی ہے کہ یہ اسرائیل کا حصہ نہیں ہے۔جنرل اسمبلی کی چار جولائی 1967 اور چودہ جولائی کی قراردادوں کے علاوہ سلامتی کونسل کی 1968 کی قرارداد نمبر 252 میں بھی اسرائیل سے یہی کہا گیا ہے کہ وہ ناجائز اور غیر قانونی اقدامات کر کے یروشلم شہر کی حیثیت بدل رہا ہے اس سے وہ اجتناب کرے۔

1990 میں اسرائیلی کی جانب سے جب مسجد اقصی میں مسلمانوں پر تشدد ہوا تو سلامتی کونسل نے 12 اکتوبر کو قرارداد نمبر 672 کے ذریعے اسرائیل کو بین الاقوامی قوانین کی پامالی کا مرتکب ٹھہرایا اور کہا کہ یروشلم اسرائیل کا حصہ نہیں ہے بلکہ یہ فلسطین کا علاقہ ہے جو اس وقت مقبوضہ حیثیت میں اسرائیل کے ناجائز قبضے میں ہے۔اس قرارداد میں اسرائیل سے کہا گیا کہ وہ اس مقبوضہ علاقے میں ان ذمہ داریوں کو ادا کرے جو اقوام متحدہ کے قوانین کے تحت مقبوضہ علاقوں کی بابت طے کر دی گئی ہیں۔

یروشلم کی حیثیت کے تعین کے لیے یہ معاملہ 2004 میں بین الاقوامی عدالت انصاف کے پاس بھی پیش کیا گیا تاکہ اس سے ''ایڈ وائزری اوپینین'' لیا جا سکے۔بین الاقوامی عدالت انصاف نے کہا کہ یروشلم اسرائیل کا حصہ نہیں ہے بلکہ اسے مقبوضہ فلسطین کہا جائے گا۔کہا گیا کہ اسرائیل یہاں دیوار تعمیر نہیں کر سکتا کیونکہ یہ علاقہ اس کا نہیں ہے بلکہ مقبوضہ ہے۔ یہ کام بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے۔عدالت نے تو یہ بھی کہا کہ جنرل اسمبلی اور سلامتی کونسل اس ضمن میں مزید اقدامات کریں۔عالمی عدالت انصاف جس مقبوضہ علاقے میں ایک دیوار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دے رہی آج امریکہ وہاں پورا سفارت خانہ لے جانا چاہتا ہے۔یہاں اس غلط فہمی کو بھی دور کر لیا جائے کہ یہ محض ٹرمپ کا فیصلہ ہے۔یاد رہے کہ امریکہ تو 1995 ہی میں یروشلم ایمبیسی ایکٹ متعارف کرا چکا ہے۔خواب پرانا ہے،اس خواب کو تعبیر البتہ ڈونلڈ ٹرمپ دے رہے ہیں۔

ترکی کو اللہ پھر عروج عطا کرے اس نے بڑا جرات مندانہ موقف اختیار کیا ہے ایسا موقف جو کسی مسلم لیڈر کا ھونا چاہیے۔